محدود تصور مذہب کا پس منظر

سلطان احمد اصلاحی

"مذہب انسان کی پرائیوٹ زندگی کا معاملہ ہے، معاملات دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں" آج کی پڑھی لکھی دنیا کا یہ وہ مسلمہ ہے جس کے خلاف زبان کھولنا کچھ آسان نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مذہب کے بارے میں یہ فیصلہ کس کا ہے اور کس بنیاد پر اسے سند اعتبار حاصل ہے؟ کیا مذہب کے ماننے والوں نے خود اس بات کا اعلان کیا یا مذاہب عالم کے علمبرداروں اور ان کے بڑے بڑے رہنماؤں کی کوئی بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس میں مذہب کے کردار کے سلسلے میں یہ فیصلہ پڑھ کر سنایا گیا؟ یا مذاہب عالم کی نمائندہ کتابیں اور ان کا نمائندہ لٹریچر اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے اور ان کی داخلی شہادت اس مقبول عام تصور کے حق میں ہے؟ آپ کو سن کر تعجب ہوگا ان میں سے کسی چیز کا جواب بھی اثبات میں نہیں ہے نہ تو مذاہب کی نمائندہ کتابیں اس کی شہادت دے رہی ہیں اور نہ ان کے علمبرداروں ہی نے کبھی اس طرح کا کوئی اعلان کیا۔ پھر سوال یہ ہے کہ اس تصور کو یہ قبول عام کس طرح حاصل ہوا اور کس طرح یہ چیز آج کی پڑھی لکھی دنیا کا مسلمہ قرار پاگئی۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ موجودہ دور میں فکر و نظر کے معمار یورپ میں پال کی ایجاد کردہ پامال مسیحیت کی کارگزاری ہے جس کے نتیجے میں مذہب کے سلسلے میں مذکورہ خیال کو سکۂ رائج الوقت بننے کا موقع ملا ہے اور بات مسیحیت تک محدود نہیں رہی، بلکہ تمام مذاہب عالم اس کی لپیٹ میں آگئے۔ اور معاملات دنیا سے بے دخلی مذہب کے تصور کا ایک لازمی جزء قرار پاگئی۔ مسیحیت کے خلاف یورپ کا یہ ردعمل کن اسباب و

عوامل کے تحت وجود میں آیا اور وہ کیا حالات تھے جن کی رعایت سے مجبور ہو کر معاملات دنیا سے اپنی بے دخلی کے یورپ کے فیصلے کو اس نے برضا و رغبت قبول کیا اور فرد کی نجی زندگی تک اپنی محدودیت کو بھی بسا غنیمت جانا۔ اور بعد میں اسی سے متاثر ہو کر دیگر مذاہب عالم بلکہ نفس مذہب کے سلسلے میں بھی یہی تصور ایک حقیقت مسلمہ قرار پا گیا، یہ ایک طویل داستان ہے جس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ہمیں یورپ میں مسیحیت کے کردار پر ایک نظر ڈالنی پڑے گی۔

یورپ کی تاریخ میں مسیحیت کا بدنما کردار

یورپ کی تاریخ میں مسیحیت کا کردار انتہائی بدنما بلکہ گھناؤنا ہے۔ رومن امپائر کے آخری ادوار سے لے کر اٹھارویں صدی کے آخر تک اس کے نمائندے ادارے چرچ اور پاپائیت جاگیرداری اور قومی بادشاہتوں کے دونوں ہی زمانوں میں مختلف انداز اور مختلف روپ میں پینترے بدل بدل کر عوام کی گردن پر سوار رہے اور ہر ممکن طریقے سے ان کا استحصال کرتے رہے۔ اس پاپائیت کے سلسلے میں ٹامس ہابس کا یہ ریمارک بالکل حق بجانب ہے کہ:

یہ وہ بدروح تھی جو بادشاہت کا تاج پہنے رومن امپائر کی قبر سے اٹھنے کا کسی طرح نام نہیں لیتی تھی[1] چوتھی صدی عیسوی میں قسطنطین اعظم کے عیسائیت قبول کرنے اور اس کے رومن امپائر کے سرکاری مذہب قرار پا جانے کے بعد[2] پورے یورپ کی آبادی پر اسے غیر معمولی

---

(1) D.R. Bhandari: History of European Political Philosphy P. 90

(2) Carl Stephenson: Mediaeval History Rev. Ed. P. 60 D.R. Bhandari: History of European Political Philosphy P. 68

اثر و رسوخ حاصل ہوگیا۔ اور اسی وقت سے اس نے اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنے اور اپنے مخالفین کے صفایا کی مہم شروع کردی تھی[1] اور پانچویں صدی عیسوی میں رومن ایمپائر کے زوال کے بعد تو آگے ایک ہزار سال تک وہ یورپ میں بلا شرکت غیرے تمام تر سیاہ و سفید کی مالک رہی۔ خاص طور پر قرون وسطیٰ (MIDDLE AGES) کا زمانہ، جس کی آخری حد اگرچہ تیرھویں[2] صدی سے لے کر پندرہویں صدی تک بتائی جاتی ہے لیکن حق یہ ہے کہ جس کا منحوس سایہ ہمیں یورپ میں سترہویں اور اٹھارویں بلکہ انیسویں صدی تک دراز نظر آتا ہے اس میں مسیحیت کے نمائندوں چرچ اور پاپائیت کو باشندگان یورپ پر جو زبردست اقتدار حاصل رہا اور اس کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے ان کا جس طرح استحصال کیا اور ان پر ظلم و ستم کے جو پہاڑ توڑے، پوری انسانی تاریخ میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے

قرون وسطیٰ میں کلیسا کے بڑھے ہوئے اثرات

قرون وسطیٰ میں کلیسا کو باشندگان یورپ پر جو زبردست اقتدار حاصل تھا اور جس طرح وہ پورے یورپ کو اپنے آہنی پنجوں میں کسے ہوئے تھا آج بیسویں صدی میں واقعہ ہے کہ اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ تاہم ڈاکٹر جیمس ہاروی رابن سن کے درج ذیل بیان سے اس کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

قرون وسطیٰ کی کلیسا موجودہ زمانہ کی کلیساؤں سے بہت مختلف تھی خواہ وہ کیتھولک ہوں یا پروٹسٹنٹ۔

(۱) سب سے پہلے ہر شخص کو اس سے تعلق رکھنا ضروری تھا جس طرح سے آج کل ہم

---

(1) G.R. Scott. The History of Torture through out the eges P.64

(2) E.S.P.Haynes : Religious Persecutions. P.35-36

کو کسی نہ کسی سلطنت سے ضرور تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کوئی شخص کلیسا کے اندر نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اس کو معمولی طور پر قبل اس کے کہ وہ اس معاملے میں کوئی رائے قائم کرنے کے قابل ہو اصطباغ دے دیا جاتا تھا۔ تمام مغربی یورپ ایک واحد مذہبی جماعت تھا جس سے بغاوت کرنا جرم تھا۔ کلیسا کی اطاعت سے انکار کرنا یا اس کی تعلیمات اور اس کے حکم پر اعتراض کرنا خدا سے سرکشی کرنا سمجھا جاتا تھا اور اس کو سزائے موت دے دی جاتی تھی۔

(۲) قرون وسطیٰ کی کلیسا آج کل کی کلیساؤں کی طرح اس کے ممبروں کے بخوشی چندوں کی آمدنی پر گذر نہیں کرتی تھی۔ علاوہ اپنی وسیع قطعات آراضی کی مالگزاری اور مختلف قسم کی فیس کے اس کو باقاعدہ ٹیکس کی بھی آمدنی تھی جس کو عشر کہتے تھے جن لوگوں کو یہ ادا کرنا ہوتا تھا ان سے بہ جبر وصول کیا جاتا تھا جس طرح کہ آج کل ہم سب کو حکومت کے ٹیکسوں کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ ظاہر ہے کہ قرون وسطیٰ کی کلیسا صرف ایک مذہبی جماعت ہی نہ تھی جیسی کہ آج کل کی کلیسائیں ہیں۔ بے شک یہ گرجاؤں کو وظائف دیتی تھی اور نمازیں پڑھانے کا انتظام کرتی تھی۔ اور روحانی زندگی پیدا کرتی تھی لیکن یہ اس سے بھی بڑھ کر کام کرتی تھی۔ ایک لحاظ سے یہ ایک سلطنت کے مانند تھی۔ کیونکہ یہ اپنا مکمل آئین جداگانہ رکھتی تھی۔ اور اس کی عدالتیں بہت سے ایسے مقدمات طے کرتی تھیں جو آج کی ہماری معمولی عدالتیں طے کرتی ہیں۔ اس کے زیر نگرانی جیل خانے بھی تھے جہاں کہ یہ مجرموں کو عمر بھر رہنے کی سزا دے سکتی تھی[۱]

کلیسا کی اس طاقت کا اندازہ اسی مصنف کے ایک دوسرے اقتباس سے بھی کیا جاسکتا ہے:

"قرون وسطیٰ کی کلیسا اپنے انداز حکومت کے لحاظ سے بجا طور پر شخصی سلطنت کہی

---

[۱] تاریخ مغربی یورپ مترجمہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا صفحات ۲۰۵، ۲۰۶

جاسکتی ہے۔ پوپ اس کا طاقت در اور مطلق العنان سردار تھا اور اس کی شخصیت میں تمام روحانی اور انتظامی اختیارات مجتمع تھے۔ وہ اعلیٰ اور فائق مقنن تھا۔ کلیسا کی کوئی کونسل خواہ کیسا ہی کوئی معاملہ اہم اور عظیم ہو اس کی مرضی کے خلاف قانون وضع نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے فرامین پوپ کی منظوری کے بغیر جائز قرار نہیں دیئے جاسکتے۔

علاوہ ازیں پوپ کو اختیار تھا کہ کلیسا کے کسی قانون کو منسوخ کر دے یا اس سے بازگشت کرے خواہ وہ کتنا ہی قدیم ہو بشرطیکہ مقدس کتابوں میں اس کا صریح حکم نہ ہو یا قدرت ایسا کرنے کے لئے مجبور نہ کرتی ہو۔ وہ وجوہات مناسب کی بنا پر تمام انسانی قوانین میں مستثنیات کر سکتا تھا۔[۱]

اسی کتاب کا ایک دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو جس سے ہمیں قرون وسطیٰ میں کلیسا کے بڑھے ہوئے اثرات کا اندازہ لگانے میں مزید مدد ملتی ہے۔

اس ضابطہ (ضابطۂ تھیوڈوسیا جو ۴۳۸ء میں درجۂ تکمیل کو پہونچا جس میں عیسائی کلیسا اور پادریوں سے متعلق تمام شاہی فرامین درج تھے) سے ہم کو اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ پادریوں کو اس بنا پر کہ ان کے سپرد مقدس امور تھے، گراں بار عہدوں کے فرائض انجام دینے اور چند ٹیکسوں کے ادا کرنے سے جو عوام الناس کے ذمہ تھے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ ان کو وصیتیں قبول کرنے کا بھی حق حاصل تھا۔ خود شہنشاہوں نے کلیسا کے نام بڑے بڑے وقف کر دیئے۔ ان کی مثال کو پیش نظر رکھ کر بادشاہوں اور خاص خاص لوگوں نے تمام قرون وسطیٰ میں عمل کیا۔ یہاں تک کہ کلیسا اس قدر مالدار ہو گئی جس کا تعین کرنا مشکل ہے یعنی اس کی آمدنی ہر سلطنت یورپ سے بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ پادریوں کو بعض مقدمات قانونی بھی طے کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اور ان کو یہ مراعات بھی حاصل تھیں کہ وہ کلیسا کی ان عدالتوں سے ان چھوٹے چھوٹے جرائم کے مقدمات کو جن میں وہ خود ماخوذ ہوں طے کرالیں۔[۲]

---

[۱] حوالۂ مذکور ص ۲۰
[۲] حوالہ سابق ص ۲۲

آگے یہی مصنف رقم طراز ہے۔ اس کے ذریعہ بھی قرون وسطیٰ میں کلیسا کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

'کلیسا کے مقدس حقوق اور اس کے بے مثال نظم ونسق اور اس کی وسیع دولت نے اس کے افسران یعنی پادریوں کو قرون وسطیٰ کا نہایت طاقتور معاشرتی طبقہ بنا دیا۔ ان کے پاس جنت کی کنجیاں تھیں اور بغیر ان کی امداد کے کوئی شخص جنت میں داخلہ کی امید نہیں کر سکتا تھا۔

خارجہ سے نہ صرف وہ کسی مجرم کو کلیسا سے علیٰحدہ کر دیتے تھے بلکہ بنی نوع انسان کو اس سے ملنے جلنے کو منع کر دیتے تھے۔ کیوں کہ وہ ملعون تھا اور اس کو شیطان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ مذہبی رسوم کے ترک کرنے سے وہ کسی شہر میں یا ملک میں مذہب کی تسلیوں کو معطل کر سکتے تھے۔ اس طرح کہ گرجا کے دروازے بند کر دیتے تھے اور تمام عام نمازوں کی ممانعت کر دیتے تھے'[1]

پادریوں کی دنیا داری

باشندگان یورپ پر اپنے اس اختیار کامل کا کلیسا نے انتہائی بے جا فائدہ اٹھایا اور انھیں اپنی ہوس دنیا پرستی کے لئے کھلی چراگاہ تصور کیا۔ اور حضرت مسیح کی ان تعلیمات کے بالکل برعکس کہ:

'میری بادشاہی اس دنیا کی نہیں'۔ (یوحنا۔ باب: ۱۸: ۳۶)

نیز یہ کہ:

'جو لوگ دولت پر بھروسہ رکھتے ہیں ان کے لئے خدا کی بادشاہی میں داخل ہونا کیا ہی مشکل ہے۔ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گذر جانا اس سے آسان ہے کہ

---

[1] کتاب مذکور ص ۲۱۷

دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔ (مرقس باب: ۱۰، ۲۴، ۲۵)

اس نے دنیا داری اور زر پرستی ہی کو اپنا واحد مطمح نظر قرار دے لیا اور دنیا کے سامنے اس کا ایسا بدترین نمونہ پیش کیا جس سے زیادہ بدتر کسی اور چیز کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پادریوں کی یہ دنیا داری کس حد تک بڑھی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھوں وہ کیسے کچھ اسیر ہو چکے تھے۔ اس کی تفصیل ہاروی رابن سن کے لفظوں میں اس طرح ہے:

"جب ہم کسی متمول پادری کی حالت پر غور کرتے ہیں تو یہ امر تعجب خیز نہیں ہے کہ اس میں بداعمالی بے انتہا پائی جاتی ہے۔ کلیسا کے عہدے روپیہ پیدا کرنے کے وہی مواقع پیش کرتے تھے جو حکومت کے عہدے، بارہویں اور تیرہویں صدی کے بعض پادریوں کی خصوصیات سے ان کا ایک پیشہ ور سیاسی مدبر ہونا بہ نسبت ایک موجودہ پادری کے خواہ وہ کیتھولک ہو یا پروٹسٹنٹ زیادہ ثابت ہوتا ہے"[1]

یہ حال بڑے اور متمول گرجاؤں کے پادریوں کا تھا چھوٹے اور غریب گرجاؤں کے پادریوں کا حال بھی ان سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھا۔ مصنف مذکور فرماتے ہیں:

"رہے غریب گرجاؤں کے پادری، وہ بھی اپنے برتروں کے برے نمونے کی تقلید کرتے تھے۔ کلیسا کی کونسلوں کے قوانین ظاہر کرتے ہیں کہ بعض اوقات پادری اپنی گرجا کو دکان بنا لیتا تھا اور شراب اور دیگر اشیاء فروخت کرتا تھا۔ وہ اپنی آمدنی میں اس طرح بھی اضافہ کر لیتا تھا کہ اصطباغ، اقرار گناہ، معافی گناہ، شادی اور مردوں کے دفن کرنے کے وقت جو اس کے فرائض میں سے تھے لوگوں سے فیس وصول کرتا تھا"[2]

پادریوں کی عدالت میں رشوت کی گرم بازاری

کسی بھی سماج میں عدالت وہ آخری دروازہ ہے جسے آدمی وقت پڑنے پر کھٹکھٹاتا

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب مذکور صـ ۲۲۱   [2] حوالہ سابق صـ ۲۲۲

ہے ۔اور وہاں اس توقع کے ساتھ جاتا ہے ۔ اور وہاں اس توقع کے ساتھ جاتا ہے کہ اسے اپنا جائز حق ملے گا اور اسے دوسروں کی ظلم و زیادتی سے نجات دلائی جائے گی ۔لیکن افسوس کہ کلیسا اس پاک جگہ کو بھی آلودہ کئے بغیر نہ رہا جس کی حالت زار کا نقشہ پوپوں کی عظمت کا قائل اور کلیسا سے بھرپور ہمدردی رکھنے والا یہ مصنف ان لفظوں میں کھینچتا ہے :

سمونی[1] اور بہت سے پادریوں کی شرمناک زندگی کے علاوہ دیگر قسم کی برائیاں بھی تھیں جن سے کلیسا بدنام ہوگئی ۔ اگرچہ پوپ خود بارہویں اور تیرہویں صدی میں عام طور پر اچھے آدمی تھے ۔اور بعض اوقات ممتاز مدبر ثابت ہوئے جنھوں نے نیک نیتی سے اپنے شعبہ کے جو وہ افسر اعلیٰ تھے نیک نام بنانے کی کوشش کی لیکن ان کے ماتحت افسران جو ان کی عدالتوں کے بے شمار مقدمات فیصل کرتے تھے سخت رشوت ستانی کیلئے بدنام تھے ۔ یہ عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ ہمیشہ فیصلہ اسکے موافق ہوگا جو سب سے زیادہ رشوت دے گا ۔ اور یہ کہ غریب آدمی کی طرف کچھ توجہ نہیں کی جاتی ۔ اسقفوں کی عدالتیں اپنے ظلم و جبر کے لئے یگانۂ روزگار تھیں کیونکہ اسقف کی آمدنی کا بڑا حصہ ایک فیوڈل رئیس کی طرح اس جرمانے سے آتا تھا جو مجرموں کو دینا پڑتا تھا ۔ ایک شخص بعض اوقات مختلف عدالتوں میں ایک ہی وقت میں طلب کیا جاتا تھا اور ایک یا دوسری عدالت کی غیر حاضری پر اس پر جرمانہ کردیا جاتا تھا ۔[2]

بہرحال ان صدیوں میں کلیسا کی لوٹ کھسوٹ اور دنیا پرستی ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت تھی جس پر اس وقت کی پوری عیسائی دنیا متفق اللفظ نظر آتی ہے ۔ اور اس کا پورا تحریری سرمایہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے ۔ پوپ کے خطوط، مقدس اشخاص کے مواعظ، کونسلوں کے قوانین، شاعروں کی ہجویں اور درباری شاعروں کی نظمیں بلا استثناء یہ تمام تحریریں کلیسا کے ظلم و استحصال کی شاکی ہیں ۔جس کی طرف مصنف مذکور ان لفظوں میں اشارہ کرتا ہے ۔

---

[1] سمونی (SIMONY) یعنی کلیسا کے عہدوں کی خرید و فروخت کا انتہائی شرمناک کاروبار ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۱۶۱ [2] حوالہ بالا ص ۲۲۲

"یہ سب تحریرات پادریوں کی ناانصافی، ان کی حرص وطمع اور ان کی اپنے مقدس فرائض سے کم توجہی کو برا کہنے میں متفق اللفظ ہیں۔ سینٹ برناڈ رنج کے ساتھ سوال کرتا ہے: تم پادریوں میں کس شخص کو پیش کر سکتے ہو جو اپنے گلہ کی جیبیں خالی کرانے کی فکر نہیں کرتا بلکہ ان کی برائیوں کو دور کرنے کی فکر کرتا ہے"[1]

بے دینی کے خلاف کلیسا کی جنگ

یہ حال تو کلیسا کے معاشی استحصال کا تھا۔ اس سے آگے سیاسی اور سماجی سطح پر اس نے باشندگان یورپ پر جو مظالم ڈھائے ہیں اور ان پر ظلم وستم کے جو پہاڑ توڑے ہیں انسانی تاریخ کا وہ انتہائی عبرت ناک باب ہے۔ اس کا سب سے زیادہ نمایاں مظاہرہ ہمیں بے دینی کے خلاف کلیسا کی جنگ میں نظر آتا ہے جس کے سلسلے میں کلیسائی نظام کا دل سے مداح اور اس کا ہوا خواہ مصنف مذکور اپنے کو ان حقائق کے اعتراف کے لئے مجبور پاتا ہے:

"جو لوگ کلیسا کی تعلیمات پر اعتراض کرتے تھے اور اس کے اختیارات کو اس سے علیحدہ کرنا چاہتے تھے، اس زمانہ کے مسلمہ خیال کے مطابق وہ بے دینی کے بڑے جرم کے مرتکب سمجھے جاتے تھے۔ کسی پکے عیسائی کے نزدیک اس شخص کے جرم سے کوئی گناہ زیادہ نہیں ہو سکتا تھا جو خدا کے خلاف بغاوت کرے اور اس مذہب کو ترک کر دے جو رومن کلیسا کے ذریعہ سے اس کے بیٹے کے فوری توابعین نے ہم تک پہنچایا تھا۔ علاوہ ازیں شک اور بے دینی نہ صرف گناہ تھے بلکہ وہ اس زمانہ کے نہایت طاقتور معاشرتی صیغہ کے خلاف بغاوت بھی تھی جو اس کے بعض افسران کی بداعمالیوں کے باوجود عام طور پر تمام مغربی یورپ کے لوگوں کے نزدیک لائق احترام تھا۔ بارھویں اور تیرھویں صدیوں کی بے دینی کا طریقہ، اس کی وسعت اور اس کے اخراج کی کوششیں جو کلیسا نے وعظ، آگ، تلوار اور

---

[1] کتاب مذکور ص۲۲۳

تحقیق مذہب کی سخت عدالتوں کے ذریعہ سے کیس قرون وسطیٰ کی تاریخ کا دہشت ناک اور عجیب وغریب باب ہے[۱]

اس جنگ کی ابتداء

محکمۂ احتساب عقائد (INQUISITION) کی صورت میں اس بے دینی کے خلاف باقاعدہ جنگ تو تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں شروع ہوئی، جیسا کہ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے، لیکن اس کا آغاز بارہویں صدی کے نصف ہی سے ہوچکا تھا جس کی تفصیل مصنف مذکور کے لفظوں میں اس طرح ہے:

"بارہویں صدی کے اختتام سے قبل دنیاوی فرماں رواؤں نے بے دینی کی طرف توجہ مبذول کی۔ ہنری دوئم شاہ انگلستان نے ۱۱۶۶ء میں حکم دیا کہ انگلستان میں کوئی شخص بے دینوں کو پناہ نہ دے۔ اور جس گھر میں ان کا پتہ چلے وہ جلا کر خاک سیاہ کردیا جائے۔ ایراگان کے بادشاہ (۱۱۹۴ء) نے یہ فرمان جاری کیا کہ جو شخص والڈنیس کی تعلیمات سنے گا یا انھیں خوراک دے گا وہ بغاوت کی سزاؤں کو برداشت کرے گا۔ اور سلطنت اس کی جائداد کو ضبط کرلے گی۔ یہ بے رحمانہ فرمانوں کے سلسلہ کی شروعات ہیں جن کو تیرہویں صدی کے نہایت روشن خیال بادشاہوں نے ان سب کے خلاف جاری کیا۔ جو ایلی جینسز یا والڈن سیس سے تعلق رکھتے تھے۔ کلیسا اور شاہی حکومت اس پر متفق ہوگئیں کہ دونوں کی بہتری کے لئے بے دین خطرناک تھے اور وہ ایسے مجرم تھے جو زندہ جلائے جانے کے مستحق تھے[۲]"

محکمۂ احتساب عقائد کا قیام (THE HOLY INQUISITION)

یورپ میں اس محکمہ کے باقاعدہ قیام کے ایک ہزار سال قبل سے ہی بے دینی

---

[۱] حوالہ سابق ص۲۲۵ [۲] حوالہ سابق صفحات ۲۲۵، ۲۲۶

کے خلاف جنگ کا اصول موجود تھا۔ چنانچہ ۳۸۲ء میں ایک ایسا قانون پاس کر دیا گیا تھا جس کی رو سے کوئی بھی شخص جو بے دینی کا مجرم ہو سزائے موت کا مستحق تھا۔ آگے کئی صدیوں تک یورپ میں عیسائیت کے قدم جما لینے کے بعد اکا دکا واقعات کی صورت میں بے دینوں کی اگرچہ خبر لی جاتی رہی اور کبھی کبھی یہ چیز ایک مہم کی صورت بھی اختیار کر لیتی تھی لیکن پھر بھی معاملہ بہت سخت نہ تھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ کلیسا کے خیال کے مطابق ایسے بہت سے بے دین فرقے ابھرنے شروع ہوئے جو قائم شدہ مسیحیت کے مدمقابل اور اس کے لئے ایک طرح سے خطرہ دکھائی دینے لگے خاص طور پر فرقہ ایلبی جینیسز (ALBIGENESES) جس کی سرگرمیاں ان سب میں زیادہ بڑھی ہوئی تھیں جس کے خلاف سخت ترین اقدام کو کلیسا نے اپنی بقا کے لئے ناگزیر تصور کیا۔ یہیں سے یورپ میں بے دینی کے خلاف باقاعدہ جنگ کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ انوسنٹ سوم (INNOCENT III) نے اپنے دیگر احباب کے مشورے سے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا جس کے نتیجے میں تیرہویں صدی کے وسط میں محکمۂ احتساب عقائد (HOLY INQUISITION) کا قیام عمل میں آیا۔ اور سینٹ ڈومینک "DOMINIQUE" اس کا پہلا عہدیدار (INQUISITOR GENERAL) منتخب کیا گیا۔[1] ۱۲۵۲ء میں انوسنٹ چہارم (INNOCENT IV) کے ایک فرمان کے ذریعہ اس محکمے کو مزید استحکام ملا۔ اور اس کے نظام کار میں مزید باقاعدگی پیدا ہوئی۔ جس کے نتیجے میں یورپ کے ہر شہر اور ہر ریاست میں مذہبی ایذا رسانی اور مذہبی استبداد وہاں کے سماجی ڈھانچے کا ایک ناگزیر جزو بن گیا لوگوں کے افکار و نظریات کو کچلنے اور آزادی فکر و نظر کو پامال کرنے کا یہ وہ طاقتور ترین آلہ تھا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔[2]

---

(1) G.R. Scott: History of Torture Throughout the Ages P. 64

(2) J.B. Bury: A History of freedom of thought. P.41,42,

یہ عدالتیں تمام یورپ میں پھیلی ہوئی تھیں

معاملہ کسی ایک علاقے یا کسی ایک ملک کا نہیں بلکہ احتساب عقائد کے نام پر پورے یورپ میں ظلم و استبداد کا بازار گرم تھا۔ پہلی عدالت تو ۱۲۳۳ء میں ٹولوس (TOULOUSE) میں قائم ہوئی۔ اس کے ایک سال بعد اراگان (ARAGON) میں اس کا قیام عمل میں آیا لیکن اس کے بعد اس کی لہر کافی تیزی کے ساتھ بڑھی اور جرمنی، ہالینڈ، اسپین، پرتگال اور فرانس ہر جگہ اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ اور مزعومہ بے دینی کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی خاطر سرگرم کار ہو گئیں[1]۔ تمام یورپ میں اس طرح کی عدالتوں کا جال بچھا ہوا تھا جس کے چنگل سے بچ نکلنا کسی بے دین کے لئے آسان نہ تھا۔ مختلف حکومتوں میں اس محکمے کے عہدیداروں کا باہم دگر گہرا اشتراک عمل تھا اور اس مہم میں ایک دوسرے کی مدد کے لئے ہر وقت مستعد رہتا تھا۔ خبر رسانی کا نظام انتہائی موثر طریقے پر کام کرتا تھا اور اس سے متعلق اطلاعات ایک ملک سے دوسرے ملک تک برابر پہنچائی جاتی رہتی تھیں۔ یورپ کے دیگر ملکوں کو تو چھوڑیئے روشن خیال کے علمبردار انگلینڈ کے اندر بھی بعض ادوار کے استثناء کے ساتھ احتساب عقائد کا یہ محکمہ ۱۶۷۶ء تک قائم تھا[2]۔

ان کا طریقۂ کار

یہ عدالتیں جو قائم تو مذہبی مقدمات کے فیصلے کے لئے کی گئی تھیں لیکن ان کی کارروائیوں میں جس مکر و فریب، دھونس دھاندلی، سنگ دلی و قساوت قلبی اور ظلم و ناانصافی کو روا رکھا جاتا تھا اس کی مثال شائد دنیا کی کسی گئی گذری عدالت میں بھی نہ مل سکے گی۔ اے۔ ایچ جانسن

---

(1) G.R. Scott: History of Torture Throughout the Ages P.65.

(2) J.B. Bary: A History of freedom of Thought P.43

کیتھولک عقیدے کا گہوارہ اسپین میں جہاں پروٹسٹنٹوں کا صفایا کرنے کی غرض سے ۱۴۷۸ء میں عدالت تحقیقات مقدمہائے مذہبی کا قیام عمل میں آیا[1]، اس کے طریقۂ کار پر ان لفظوں میں روشنی ڈالتا ہے۔

صدر حاکم اس مجلس کا بڑا ہوتا تھا جس کو خود بادشاہ مقرر کرتا تھا، اور متعدد ماتحت عدالتیں بھی قائم کی جاتی تھیں جن کی حفاظت مسلح حاضر باشوں سے ہوتی تھی۔ رازمیں تحقیقات عمل میں لاتی تھیں۔ اشخاص کو تحریص و ترغیب دلائی جاتی تھی یا دھمکیاں دے کر مجبور کیا جاتا تھا کہ اپنے دشمن، اپنے دوست بلکہ اپنے عزیز و اقارب پر بھی لعنت ملامت کرتے رہیں۔ یا اس طرح ایک نظام جاسوسی قائم کیا گیا، ملزمین کو اقرار جرم پر مجبور کرنے کے لئے سخت تکالیف دی جاتی تھیں، اور انتہا درجہ بے ضرر الفاظ سے ڈامنیکی[2] علماء لطیف باریکیاں پیدا کر کے کھینچ تان کر اکثر الحاد کے معنی نکال لیتے تھے۔ یہ لوگ کئی طرح کی سزا دیتے تھے، مال ضبط کر لیتے تھے، نفس کشی کراتے، کفارہ دلواتے تھے، قید کر دیتے تھے اور آخری چارہ جوئی یہ ہوتی تھی کہ:

---

[1] واضح رہے کہ اسپین میں یہ محکمہ انیسویں صدی عیسوی تک قائم تھا۔ ملاحظہ ہو حوالہ سابق[۴] اس بیچ میں دو یا تین بار اس کا خاتمہ (abolish) ضرور عمل میں آیا۔ لیکن پھر وہ جلد ہی بحال (Restore) کر دی جاتی۔ آخری طور پر اس کا خاتمہ ۱۸۳۴ء میں عمل میں آیا اس کا مطلب ہے کہ اسپین میں یہ محکمہ (Holy office) ساڑھے تین سو سال تک قائم رہا بحوالہ Religion as a Bar to Progress P. 32.33.

[2] سینٹ ڈومنی نیک ۱۱۷۰ء میں پیدا ہوا۔ وہ پادری تھا اور اس نے اسپین کی ایک یونیورسٹی میں دس برس تک باقاعدہ دینیات کا درس لیا تھا۔ ۱۲۰۶ء میں وہ اپنے اسقف کے ہمراہ جنوبی فرانس آیا۔ اس نے اپنی زندگی کو بے دینی کے اخراج کے لئے وقف کرنے کا عزم مصمم کر لیا تھا۔ ۱۲۱۴ء تک یورپ کے مختلف حصوں سے صرف چند اشخاص اس کے ہمدرد

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

مذہبی عدالت سے سزائے موت کا حکم سنایا جاتا تھا اور مجرم کو دنیاوی حکام کے حوالہ کر دیا جاتا تھا تاکہ اس کو نذر آتش کر دیا جائے[1]

سزایافتہ بے دین کی قسمت کا یہی حال ہیں ایک دوسرے مصنف کے ذریعہ بھی معلوم ہوتا ہے:

"اگر مشتبہ شخص اپنے قصور کا اعتراف کرتا تھا اور اپنی بے دینی ترک کرنے کا حلف اٹھاتا تھا اس کا قصور معاف کر دیا جاتا تھا۔ اور پھر کلیسا میں داخل کر لیا جاتا تھا۔ لیکن عمر بھر کی قید کا کفارہ اس سے ادا کرایا جاتا تھا کیوں کہ اس کے ناگفتہ بہ گناہ کا یہی مناسب علاج تھا۔ اگر وہ بغیر توبہ کے رہتا تھا تو وہ دنیاوی حکومت کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جاتا تھا یعنی کلیسا جس کا قانون اس کو خون بہانے کی اجازت نہیں دیتا وہ مجرم کو دنیاوی حکومت کے حوالہ کر دیتی تھی جو اس کو مزید تحقیقات کے بغیر زندہ جلا دیتی تھی[2]

ایک دوسرا مصنف ان عدالتوں کے ظالمانہ طریقہ کار کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے:

"اسپین میں بے دینی کے ملزموں کے ساتھ مقدمے کی کارروائی میں جو طریقہ کار اختیار کیا جاتا تھا، صداقت کی یقین دہانی کے قابل فہم ذرائع سے اسے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ ایسے قیدی کے بارے میں پہلے ہی سے یہ خیال قائم کر لیا جاتا تھا کہ وہ مجرم ہے، اور

اور شریک حال ہو سکے۔ لیکن ۱۲۲۱ء تک ڈومی نیکن فرقہ کامل طور پر مرتب ہو گیا اور اس کی ساٹھ ہزار خانقاہیں مغربی یورپ میں مختلف مقامات پر موجود تھیں۔ یہ لوگ ڈومی نیکنس وعظ کہنے والے فقراء کہلاتے تھے اور ان کو دینیات کی عمدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ تاکہ بے دینوں کے دلائل عمدہ طور پر رد کر سکیں۔ پوپ نے ان کو انکوزیشن کا خاص کام سپرد کر رکھا تھا۔ بحوالہ تاریخ مغربی یورپ صفحات ۲۲۴، ۲۲۵۔ اس مقام پر ڈامنی کی مذہب سے اشارہ اسی فرقے کے علماء کی طرف ہے جن کو تفتیش عقائد کی عدالتوں پر غیر معمولی اثر و اقتدار حاصل تھا۔ جب کہ یہی ڈومی نیک، جیساکہ گذرا اس کا پہلا باقاعدہ انکوزیٹر جنرل تھا۔

[1] اے ایچ جانسن ایم اے: یورپ سولھویں صدی میں۔ ترجمہ مولوی رحیم الدین صاحب ایم اے صفحات ۳۴۰، ۳۴۱ [2] تاریخ مغربی یورپ / ۲۲۸، ۲۲۹

اپنی بے گناہی کا ثبوت فراہم کرنے کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی تھی۔ اس کے خلاف جتنی بھی گواہیاں ہوتی تھیں، خواہ وہ کتنی ہی غیر معروف کیوں نہ ہوں، قبول کرلی جاتی تھیں۔ اس مقدمے کو آگے بڑھانے کے لئے مطلوب گواہیوں کے لئے تو اصول بہت نرم تھے۔ البتہ دفاع کے مقصد سے گواہیوں کو مسترد کرنے کے اصول بہت سخت تھے۔ یہودی، مور، غلام (یعنی ساری بے دین اور پست اقوام) قیدی کے خلاف تو گواہی دے سکتے تھے۔ البتہ اس کے حق میں انھیں گواہی دینے کی اجازت نہ تھی۔ خلاصہ یہ کہ یہ مذہبی عدالت (INQUISITION) جس اصول پر عمل پیرا تھی وہ یہ کہ چاہے سو بے گناہ سزا کی لپیٹ میں آجائیں لیکن ایک قصوروار بچ کر نہ نکل پائے[1]

اور معاملہ صرف اسپین کی عدالت تک محدود نہیں۔ پورے یورپ میں احتساب عقائد کی عدالتوں میں عام طور پر اسی طرح کی ظالمانہ کارروائی ہوتی تھی۔ یہ عدالتیں جن کا مقصد ملک سے بے دینی کا خاتمہ اور اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا تھا۔ اس کے لئے انھوں نے جاسوسوں کی خدمات دسیع پیمانے پر حاصل کر رکھی تھیں، جو ملک کے طول و عرض میں اپنی مہم پر لگے رہتے تھے۔ کسی شخص کی طرف سے معمولی سے معمولی تبصرہ بھی جس سے کسی بھی درجے میں بے دینی کا اشتباہ ہوتا ہو اس بات کے لئے کافی تھا کہ اسے عدالت کے سامنے لا حاضر کیا جائے۔ گواہی دینے والے پورے اطمینان اور روانی کے ساتھ جھوٹ بولتے تھے جس کا سبب مزعومہ بے دینوں کے تئیں ان کی نفرت و عداوت ہی نہیں بلکہ اس کا بڑا مقصد مقدس عدالت (HOLY OFFICE) کے ذمہ داروں کو خوش کرنا ہوتا تھا[2] متہم افراد کے خلاف ثبوت فراہم کرنے کے لئے انتہائی نامناسب ذرائع استعمال کئے جاتے تھے۔ اور اس مقصد کے حصول کی خاطر ان کے ساتھ خوفناک قسم کی

---

(1) A History of Freedom of Thought P. 44

(2) History of Torture Throughout the Ages P. 65

زیادتیاں روا رکھی جاتی تھیں[1]

بے دینی کی ٹوہ اور اس کے دائرے کی وسعت

بے دینی کے خلاف کلیسا کا جوش اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ بہت سے افراد کی طرف سے مسلسل اظہار برات کے باوجود انھیں اس جرم میں گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ اگرچہ وہ زبان سے اس کا انکار کر رہے ہوں لیکن ان کے کسی عمل سے یہ چیز مترشح ہوتی نظر آتی تھی۔ چنانچہ ہاروی رابن سن کہتے ہیں: "کسی مشتبہ شخص کا یہ کہنا کہ وہ بے دین نہیں ہے قابل توجہ نہ تھا کیوں کہ یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وہ قدرتاً اپنے قصور سے انکار کرے گا، جیسا کہ کوئی دوسرا مجرم کرتا ہے۔ پس ایک شخص کا اعتقاد اس کے ظاہری افعال سے دیکھا جاتا تھا۔ لہٰذا ایک شخص محکمۂ احتساب عقائد کے ہاتھوں میں صرف اس بنا پر بھی پڑ جاتا تھا کہ وہ کسی بے دین سے بلا خیال اس امر کے گفتگو کرتا ہوا پایا جائے کہ وہ کلیسا کی رسوم کی مناسب عزت و احترام نہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو یا اس کے خلاف اس کے ہمسائے حاسدانہ شہادت دے دیں واقعی محکمۂ احتساب عقائد کی اور اس کے ضابطہ کی یہ نہایت خطرناک حالت تھی۔ اس نے قصہ کہانیوں کو یقین کیا اور نہایت بے رحمانہ طریقوں سے کام لیا اور ان لوگوں کو سزائیں دیں جو نہایت سرگرمی کے ساتھ اس بات سے انکار کرتے تھے کہ ان کے خیالات کلیسا کے خیالات سے مختلف ہیں"[2]

بے دینوں کی تلاش اور ان کی ٹوہ کے سلسلے میں کلیسا کا یہ جوش کبھی کبھی ایک مہم کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ بے دینی کو ڈھونڈ نکالنے کا یہ سب سے کامیاب اور موثر ترین ذریعہ تھا جسے اڈکٹ آف فیتھ (EDICT OF FAITH) (عقیدے کا فرمان)

---

(1) C.T. Gorham: Religion As A Bar to Progress P. 31

(2) تاریخ مغربی یورپ / ۲۲۸

کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جس کے تحت لوگوں کو وسیع پیمانے پر انکوزلیشن کے کام میں لگایا جاتا تھا اور اس کا مطالبہ ہوتا تھا کہ ہر شخص جاسوسی کے فرائض انجام دے۔ اس مقصد کی خاطر وقتاً فوقتاً کسی ضلع کا انتخاب عمل میں آتا اور وہاں پہنچ کر ایک فرمان جاری کر دیا جاتا تھا کہ جس کسی کو جہاں کہیں کسی بے دینی کا سراغ ہو وہ آئے اور اس کی تفصیلات سے آگاہ کرے جس سے روگردانی کی صورت میں وہ خوفناک قسم کی دنیوی اور اخروی سزاؤں کا مستحق قرار پاتا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ہر شخص ہر وقت شبہے کی حالت میں گرفتار تھا۔ ہمسایوں اور پڑوسیوں کا تو ذکر ہی کیا خود اپنے خاندان کے افراد کی طرف سے بھی وہ محفوظ و مامون نہ تھا۔ اس پر جس قدر بھی آنسو بہایا جائے کم ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نظام کے تحت مخبری کو ایک عظیم مذہبی خدمت قرار دیا گیا تھا۔[1]

اور معاملہ صرف تاریک صدیوں اور قرونِ وسطیٰ ہی کا نہیں بلکہ اصلاح، روشن خیالی اور نشاۃ ثانیہ کی علمبردار سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی تک مذہبی جبر و تشدد کی یہ وبا مہذب یورپ کے اکثر و بیشتر ممالک کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوتی تھی۔ ہر جگہ انتہائی سرگرمی کے ساتھ بے دینوں کی تلاش جاری تھی جس کے نتیجے میں کوئی بھی شخص بے دین (HERETIC) قرار پا سکتا تھا اگرچہ خود اسے دور دور تک اس کا پتہ نہ ہو۔[2]

جیلوں کی ایذا رسانیاں اور اس کے کارندوں کے لامحدود اختیارات

احتساب عقائد کی ان عدالتوں کے اپنے الگ قید خانے بھی تھے جن میں بے دینی کے مجرموں کو اقبالِ جرم پر مجبور کرنے کے لئے سخت ترین سزائیں دی جاتیں اور طویل ترین ایذا رسانیوں کا شکار بنایا جاتا تھا۔ اس محکمے کے ذمہ داروں نے ایذا رسانی کو ایک فائن

---

(1) A History of freedom of thought P.44

(2) Religion as a Bar to Progress. P 33, 34

آرٹ کی شکل دے دی تھی جس میں مجرم پر اثر انداز ہونے کے لئے انتہائی طور پر نفسیاتی باریکیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اسے دیکھ کر مضبوط سے مضبوط ذہن و دماغ کے آدمی کی بھی قوت دفاع جواب دے جاتی تھی۔ ایذا رسانی کا ایک خاص کمرہ (TORTURE CHAMBER) ہوتا تھا جس میں اس مقصد کے لئے مختلف آلات موجود ہوتے تھے، جس کا مشاہدہ کرنے کے بعد کوئی فولادی عزم کا انسان ہی اپنے کو خوف و دہشت اور مایوسی سے بچا سکتا تھا۔ یہ کمرہ (APARTMENT) عام طور پر زیر زمین (UNDER GROUND) ہوتا تھا جس میں روشن دان نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ بس دو موم بتیاں ہوتی تھیں جن پر روشنی کا تمام تر دار و مدار تھا۔ اس کا ذمہ دار (EXECUTIONER) خوف و دہشت کی ننگی تصویر ہوتا۔ سر سے پاؤں تک کالے لباس میں ملبوس جس میں سر کے ساتھ اس کا چہرہ بھی ڈھکا ہوتا، صرف دونوں آنکھوں کے لئے سوراخ کھلے ہوئے کالی ٹوپی (COWL) پہنے وہ انتہائی ہیبت ناک اور بالکل شیطانی مرقع نظر آتا تھا۔[1]

صرف پرتگال کی عدالت کے پاس اس طرح کے تین سو قید خانے (DUNGEONS) تھے۔ انتہائی تنگ و تاریک اور سیلن سے شرابور۔ قیدیوں کی رہائش کے لئے ان میں جو سہولت میسر تھی وہ اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ سونے کی چارپائی، ایک پیشاب کی جگہ، ایک ہاتھ دھونے کی جگہ، دو مٹی کی صراحیاں ایک لیمپ اور ایک پلیٹ۔ غذا انھیں انتہائی خراب دی جاتی اور وہ بھی بہت تھوڑی مقدار میں۔ انھیں بولنے اور کسی قسم کا شور کرنے کی مطلق اجازت نہ تھی اور جیل کے ضوابط کی ادنیٰ خلاف ورزی پر انھیں سخت ترین سزائیں دی جاتی تھیں۔[2] اس سلسلے میں لسبان کی عدالت کا حال بیان کرتے ہوئے ٹورس ڈی کسٹیلا 'TORES DE CASTILLA' لکھتا ہے:

---

(1) History of Torture throughout the Ages P.66,67
(2) Ibid. P. 65

اگر کسی شخص سے ذرا بھی چوک ہو جاتی اور ضوابط کی ادنیٰ خلاف ورزی عمل میں آجاتی ہے تو اس پر انتہائی بے دردی سے ساتھ کوڑے برساتے ہیں۔ اسے ننگا کرکے زمین پر منہ کے بل لٹا دیتے ہیں۔ اس حال میں کئی آدمی اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے اور دوسرے حد درجہ بے رحمی کے ساتھ کوڑے برسا رہے ہوتے ہیں۔ کوڑے کو پگھلے ہوئے تارکول میں ڈبو کر نکال لیتے ہیں اور جب وہ خوب سخت ہو جاتا ہے تب اس سے مار لگاتے ہیں اس طور پر کہ اس کی ہر ضرب کے ساتھ گوشت کے ٹکڑے اڑ جاتے ہیں اور پوری پیٹھ ایک رستا ہوا ناسور بن جاتی ہے۔[1]

ایذا رسانی کی مختلف صورتیں تھیں۔ چرخی (PULLEY) تختے پر لٹا کر شکنجے میں کسنا (RACK) اور زندہ جلا دینا[2] (FIRE) ایک مجرم پر ایذا رسانی کے اس عمل کو بار بار دھرایا جاتا تھا[3] اور اس کا سلسلہ کئی کئی گھنٹے تک جاری رہتا تھا فلپ سوم نے اپنے ایک فرمان کے ذریعہ اس کی آخری حد اگرچہ ایک گھنٹہ مقرر کر دی تھی لیکن بے شمار مثالیں اس کے حق میں ہیں کہ اس کا لحاظ نہ کرتے ہوئے ایذا رسانی کا عمل کافی لمبے وقفے تک چلتا رہتا تھا۔ بلکہ لی (LEA) کے بقول تو اس کا سلسلہ دو گھنٹے سے لے کر تین گھنٹوں تک دراز رہتا تھا۔ اس کے سلسلے میں اس نے ایک مثال بھی بیان کی ہے۔ یہ واقعہ ۱۶۴۸ء کا ہے جب کہ والاڈولڈ ' VALLADOLID ' میں انٹونیا لوپز (ANTONIA LOPEZ) نامی ایک شخص کی آٹھ بجے سے لے کر گیارہ بجے تک مسلسل ایذا رسانی کی جاتی رہی جس کے نتیجے میں اس کے بازو بالکل مفلوج ہو کر رہ گئے۔ بیچارے غریب نے اپنا گلا گھونٹ کر خودکشی کی بھی ناکام کوشش کی۔ بالآخر جیل میں ایک مہینے کے اندر ہی اندر

---

(1) Ibid 67, 68 (2) History of Torture throughout the Ages P. 67 تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں اسی کتاب کے صفحات ۱۶۸، ۱۶۹
(3) Ibid P. 69

وہ موت کے منہ میں چلا گیا[1]

واقعہ یہ ہے کہ احتساب عقائد کی ان عدالتوں نے ایذارسانی کی جو مختلف شکلیں ایجاد کر رکھی تھیں اور جن مختلف طریقوں سے وہ مزعومہ مجرموں کو بہیمیت و درندگی کا مزہ چکھاتی تھیں اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ان کی دہشت ناکی کا اندازہ بس آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ محض کسی شخص پر بے دینی کا الزام عائد کر دیا جانا اور اسے عدالت میں حاضری کا پروانہ مل جانا اس بات کے لئے کافی تھا کہ مضبوط سے مضبوط مرد یا عورت کے اندر بدترین قسم کی خوف و دہشت کی لہر پیدا کر دے۔ اس لئے کہ یہ شاذونادر ہی تھا کہ کوئی شخص ایذارسانی کے اس ہال کے دروازوں میں داخل ہوا اور ذہنی اور جسمانی طور پر وہاں سے صحیح سالم نکل سکے۔ اگر وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو انتہائی شاذونادر اور استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر، ذہنی اور جسمانی طور پر ہمیشہ کے لئے بالکل معذور اور اپاہج ہو جاتا تھا[2]

عدالت کے کارندوں (INQUISITORS) کو لامحدود اختیارات حاصل تھے ان کے اوپر کسی کی نگرانی تھی نہ وہ کسی کے سامنے جوابدہ تھے[3] چنانچہ وہ اپنے اس اختیار کا انتہائی ناجائز طور پر فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان کو جو وسیع اختیارات حاصل تھے اس کے اندر یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ جس قیدی کے بارے میں چاہیں اس کی ایذارسانی کے احکام صادر کر دیں، اس کا فائدہ اٹھا کر وہ ہر اس شخص سے جس سے انھیں کسی قسم کا بغض اور عداوت ہوتی انتہائی آسانی کے ساتھ اپنے جرم کا اقبال کرا لیتے تھے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف وہ لوگ جو ان کے خیال کے مطابق بدعقیدہ اور بے دین (HERETIC) تھے بلکہ ان کے ہم مذہب افراد یعنی کیتھولک بھی ہمیشہ اپنے کو خطرے میں گھرا ہوا محسوس کرتے

---

(1) Ibid P.69,70

(2) History of Torture Throughout the Ages P.74

(3) A History of freedom of thought P.42

تھے[1] یہی نہیں بلکہ اس محکمہ کے بہت سے ذمہ داران (INQUISITORS) سادیت پسند (SADIST) تھے جن کی جنسی ہوس کی تسکین ایذارسانیوں کے بغیر ہوتی ہی نہ تھی۔ دوسرے وہ تھے جو بدترین قسم کے شہوت پرست تھے۔ چنانچہ یہ لوگ حسب دلخواہ بے دینی کے بالکل من گھڑت الزامات پر جس قدر عورتوں کو چاہتے پکڑ لیتے اور آئندہ زندگی بھر کے لئے انھیں اپنے پاس بطور داشتہ کے رکھتے۔ چنانچہ جب فرانسیسی فوجوں نے شہر آراگان (ARAGOAN) پر قبضہ کیا۔ اور لفٹننٹ جنرل ایم۔ ڈی۔ لیگل (M.D. LEGAL) نے انکوئزیشن کے دروازوں کو کھولنے اور اس کے قیدیوں کو رہا کرنے کے احکامات جاری کئے جن کی کل تعداد اس وقت چار سو تھی، "تو ان میں ساٹھ انتہائی حسین عورتیں بھی نکلیں جو غالباً تین بڑے انکوزیٹرس کے لئے بطور حرم سرا کے کام دیتی تھیں"۔ ان میں سے ایک عورت نے جو بعد میں مذکورہ فرانسیسی سپہ سالار کی بیوی بن گئی تھی، اپنی داستان کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے جسے پڑھ کر نہ صرف یہ کہ آدمی کا سر شرم سے جھک جاتا ہے بلکہ اس کی منظر کشی سے جسم کے رونگٹے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں[2] یہ لوگ اکثر و بیشتر انکوزیشن کے جیلوں میں انتہائی پاکباز اور باعصمت خواتین کو بند کر دیتے تھے۔ اور ان کی ایذارسانی میں بے حیائی کے وہ طریقے اختیار کرتے تھے جن کی تفصیلات کوئی شریف آدمی مشکل ہی سے اپنی زبان سے بیان کر سکتا ہے[3]

عقیدہ کا عمل (THE AUTO DAFE)

ایذا رسانی کے اس سلسلے کی آخری کڑی آٹوڈیف یعنی 'عقیدہ کا عمل' تھا۔ جس کے اندر سزا یافتہ قیدیوں کو ایک خاص وقت پر جو پہلے سے طے شدہ ہوتا تھا جلوس کی شکل

---

(1) History of Torture Throughout the Ages P.74

[2] حوالہ سابق صفحات ۷۵ تا ۸۱ [3] حوالۂ مذکور ۷۶

میں سزا گاہ تک لے جایا جاتا تھا۔ اسی تقریب کا نام آٹو ڈیف (AUTOS DA FE) یعنی عقیدہ کا عمل (ACT OF FAITH) یا زنداں سے رہائی (GAOLDELIVERY) تھا۔ عقیدہ کے عمل کی یہ تقریبات پابندی کے ساتھ کسی متعین وقت پر منعقد نہیں کی جاتی تھیں۔ نہ ہر سال ہی ان کا انعقاد ضروری تھا۔ اس کا فیصلہ تمام تر مقدس عدالت (HOLY OFFICE) کے سپرد تھا۔ سال بھر بعد یہ منعقد ہو سکتی تھیں، اسی طرح دو تین بلکہ چار سال کے وقفے کے بعد بھی ان کا انعقاد عمل میں آسکتا تھا۔ یہ تقریب جس کا انعقاد بہر حال اتوار کے دن ہی عمل میں آتا، اسے دیکھنے کے لئے تمام آبادی گھروں سے باہر نکل آتی تھی۔ عوام کی موجودگی ہی میں ان مجرموں کو نذرِ آتش کیا جاتا تھا تاآنکہ وہ مر جائیں یا پھر دوسرے طریقوں سے انھیں لقمۂ اجل بنایا جاتا تھا۔[1]

اس کارروائی کی ممکنہ سہولت جو میسر آسکتی تھی وہ بس یہ کہ اگر قیدی اپنے گناہ کا اقرار کر لیتا اور دوبارہ کیتھولک عقیدہ اختیار کرتے ہوئے اپنی جان دینی چاہتا تو اسے یہ خصوصی حق (PRIVILEGE) حاصل ہوتا کہ پہلے اس کا گلا گھونٹ کر مار دیا جائے پھر اسے نذرِ آتش کیا جائے۔ اس کے برخلاف اگر وہ مثلاً ایک پروٹسٹنٹ یا کسی دوسرے بے دین فرقے کے ایک فرد کی حیثیت سے مرنا چاہتا تو اسے زندہ ہی بھون دیا جاتا تھا۔[2]

ان آٹو ڈیفس کے ذریعے کتنے لوگ لقمۂ اجل بنے ہوں گے اس کا اندازہ صرف اس سے کیجئے کہ ۱۴۸۱ء میں جب سیول (SEVILLE) میں پہلی مرتبہ اس تقریب کا انعقاد عمل میں آیا تو بس اس سال کے آخر تک تقریباً تین سو اشخاص کو نذرِ آتش کیا جا چکا تھا۔[3] جیسا کہ گذر چکا اس تقریب کا انعقاد عوام کی موجودگی میں عمل میں آتا تھا لیکن دوسرے

---

(1) History of Torture Throughout the Ages P.70

(2) Ibid. P. 71

(3) Religion as a Bar to Progress P. 32

ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ پبلک کے لئے یہ چیز کافی تفریح کا سامان فراہم کرتی تھی اور وہ بڑی مسرت کے ساتھ اس کا نظارہ کرتے تھے۔ چنانچہ اے ایچ جانسن کا بیان ہے۔

"خود سیویلی میں پہلے ہی دن آٹھ سو آدمیوں کو گرفتار کیا گیا۔ اور ۲۱ مئی ۱۵۵۹ء کو ولاڈ ولیڈ کی گلیوں میں سب سے پہلی مرتبہ سزائے موت دی گئی یہی رسم اسپین میں فلپ کے ورود کے موقعہ پر ادا کی گئی، اور ۱۵۶۰ء میں فرانس کی الزبتھ کے ساتھ اس کی تیسری شادی کی شادمانیوں کے اثنا میں تیسری مرتبہ سزائے موت دی گئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کچھ سال کوئی رسم اس وقت تک مکمل تصور نہیں کی جاتی تھی جب تک کہ مذہبی عدالت سے کسی کو سزائے موت نہ دی جائے۔ اور اسپینی بیلوں کی لڑائی پر اس کو ترجیح دی جاتی ہے۔"[1]

---

[1] یورپ سولہویں صدی عیسوی میں صفحہ ۴۲

تصانیف مولانا صدر الدین اصلاحی

اسلام۔ ایک نظر میں	۱۵-۰۰	دین کا قرآنی تصور	۸-۰۰
اساسِ دین کی تعمیر	۱۲-۰۰	فریضۂ اقامت دین	۸-۰۰
اسلام اور اجتماعیت	۵-۰۰	قرآن مجید کا تعارف	۳-۰۰
تحریک اسلامی ہند	۱۰-۵۰	نکاح کے اسلامی قوانین	۳-۰۰
حقیقت نفاق	۴-۲۵	مسلم پرسنل لا دینی و ملی نقطۂ نگاہ سے	-۴۰
مسلمان اور دعوت اسلام	۱-۰۰	یکساں سول کوڈ اور مسلمان	-۶۰
دین کا مطالعہ	-۷۵	تلخیص تفہیم القرآن	زیرِ طبع

ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی ۔ دہلی ۶